زبیر رضوی: جدید نظم کا البیلا شاعر

خان حسنین عاقبؔ

علامہ اقبال ٹیچرس کالونی، واشم روڈ، پوسد۔445215 (مہاراشٹر)، موبائل:9423541874

زبیؔر رضوی ہمارے عہد کے ایک نمائندہ نظم گو شاعر ہیں اور جدید اردو نظم ان کے تذکرے کے بغیر ادھوری ہی رہے گی۔ زبیؔر نے غزل میں بھی وہی مقام حاصل کیا ہے جو انھیں نظم میں حاصل ہے۔ زبیر اردو نظم میں تازہ کار لہجے کے امین ہیں۔ شاعری بہ ظاہر اور بہ باطن، بہ ہر دو صورت، تخلیق ہے اور تخلیق کو باطن سے ظاہر کی طرف سفر کرنے کے لیے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے، اور الفاظ کو احتیاج ہوتا ہے ہیئت کا۔ یہ سب عوامل جب یکجا ہوجاتے ہیں تو شاعری ظہور میں آتی ہے۔ لفظ کی تخلیقی قوت Creative Force اگر شدید ہو تو شاعری کا تاثر بھی شدید ہوجاتا ہے اور اگر لفظ کی اسی تخلیقی قوت کی روانی Flow مدھم ہو تو شاعری کا تاثر ملاحظہ کنانی کا مرہون ہوجاتا ہے۔ بقول ولیم ورڈس ورتھ، "All poetry is the spontaneous overflow of powerful feeling." یعنی جذبات کے طاقتور اور برموقع بہاؤ کے نتیجے میں اچھی شاعری وجود میں آتی ہے۔ زبیؔر کی شاعری اسی زمرے میں رکھی جانے والی شاعری ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے، لیکن سب سے اہم بات جس سے میں متاثر ہوا، وہ ہے ان کی نظموں کا اسلوب اور طرزِ اظہار۔ ان کی نظموں کا اسلوب خود ان کا اپنا اختراع کردہ ہے، اس میں کوئی دورائے نہیں ہے اور اس معاملے میں وہ سرے سے خودکفیل ہیں یعنی ایسا کچھ نظر نہیں آتا کہ اس معاملے میں انھوں نے کسی کا تاثر قبول کیا ہو اور ان کی اس خوبی کے لیے ان کا تخیل ذمہ دار ہے، وہ تخیل جس کے بارے میں مولانا الطاف حسین حالؔی 'مقدمۂ شعر و شاعری' میں لکھتے ہیں کہ ''یہ (تخیل) وہ ملکہ ہے جس کو شاعر ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لے کر نکلتا ہے اور جو اکتساب سے حاصل نہیں ہوسکتا۔'' زبیؔر اپنی جوانی میں جتنے وجیہ تھے، ان کی شاعری آج بھی اتنی ہی وجیہ ہے، اتنی ہی بانکی اور سجیلی ہے اور اتنی ہی نرم رو، سبک خرام اور ملیح ہے۔ وہ تلخ موضوعات کو بھی بڑی آہستگی سے اور نرم خوئی کے ساتھ شعر کے سانچے میں ڈھالتے ہیں، اسی طرح جیسے کوئی انسان کانچ کے برتن کو طاق سے نیچے بڑی احتیاط کے ساتھ اتارتا ہے۔ نظم 'توشہ' میں وہ اپنی فکر کو یوں صورتِ اظہار دیتے ہیں:

''ہر اک صبح
مرے شہر کا یہی ہے چلن
یہاں کے لوگ بڑے اور چھوٹے ناموں کی
اٹھائے تختی
لفافوں میں لنچ باکس لیے
بسوں کی لمبی قطاروں سے آ کے ملتے ہیں
بسوں کی سرخ سیاہ تختیوں کو پڑھتے ہیں
قطار ٹوٹتی ہے
کھلبلی سی مچتی ہے
تمام لوگ بڑے اور چھوٹے ناموں کی
تمام تختیاں پھینک دیتے ہیں
لفافے لنچ کے ہاتھوں میں روک لیتے ہیں۔''

کیا آپ سمجھے کہ ابتدا میں شاعر کے شہر کے لوگ بڑے اور چھوٹے ناموں کی تختیاں اٹھائے ہوئے ہیں اور پھر جوں ہی قطار ٹوٹ کر منتشر ہوتی ہے، ان لوگوں کے سارے شخصی تحفظات ہوا ہوجاتے ہیں اور یہ لوگ ان تختیوں کو پھینک کر 'ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز' کی عملی تفسیر بن جاتے ہیں؟ زبیر کی یہ نظم شہری زندگی کی بیزار کن اور بوجھل اقدار کا نوحہ ہے۔ جس میں ہندوستان کے دارالخلافہ اور تاریخی شہر دہلی کے متوسط طبقہ کی زندگی کے روز نامچہ کا آغاز دکھائی دیتا ہے۔ زبیر کی سب سے بڑی خصوصیت، جسے میں اپنی پسند اور ترجیح کے اعتبار سے دیکھتا ہوں اور اسے حرفِ آخر بھی نہیں سمجھتا، یہ ہے کہ بیانیہ اسلوب میں بھی اپنی شخصیت کی آئینہ داری کے رموز سے خوب واقف ہیں۔ ان کی فکر کی نزاکت اور خیال کی ندرت، دونوں ان کے اظہار میں بہ آسانی ڈھونڈی جاسکتی ہیں۔ ان کی نظم 'خوشبو کی اسیری' کا بیانیہ دیکھئے:

''وصل کی ہنستی ہوئی اک شب ملی
تشنگی کی دھوپ میں تپتے بدن
قرب کی آسائشوں میں کھو گئے

رشتۂ دل، ساعتوں کی گود میں
آرزو کے خواب لے کر سو گئے
صبح چمکی تو امیرِ شہر نے
ساری دیواروں پر شیشے چُن دیے
ساری دیواروں کو اونچا کر دیا۔''

موضوع کے لحاظ سے اس نظم کا اختتامیہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف احتجاج کی غمازی کرتا ہے۔ ابتدائیہ لازماً وصل کے کیف آور تصور سے ملحق ہے۔ رشتۂ دل کا ساعتوں کی گود میں آرزو کے خواب لے کر سو جانا، واہ۔ کیا طرزِ اظہار ہے، لیکن اختتامیہ اتنا ہی چونکا دینے والا، غیر متوقع اور ڈرامائی ہے۔ مجھے اپنا کام کرتے ہوئے یعنی تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے دیکھ کر الکزینڈر پوپ اپنی تصویر سے باہر نکل کر کہہ رہا ہے۔

Tis hard to say, if greater want of skill
Appears in writing or in judging ill"

یعنی ناقد کا کام، صرف نقدِ فن ہے نہ کہ تحسین و تنقیص شخصی۔ بقول پوپ، شاعر کے مکمل شعری محاصل کے بجائے صرف تفصیلات کا جائزہ لینا، خراب اور ناقص تنقید کی وجوہات میں سے ایک ہے۔ ٹیری ایگل Terry Eagle نے بھی کہا ہے کہ:

Criticism today lacks all substantive social function.

یعنی ''تنقید میں آج کل خالص سماجی ذمہ داریوں کا فقدان ہے۔'' اس لیے اگر میں یہ بات بیان نہ کروں تو ادبی بد دیانتی ہوگی کہ میرے شعورِ نقد نے زبیر کی نظموں کے مطالعے کے دوران یہ محسوس کیا ہے کہ ان کے یہاں تجربات، مشاہدات اور احساسات کا آمیزہ ہے جن سے ایک شعر پارہ خلق ہوتا ہے۔ بلکہ زبیر کے یہاں ان تینوں میں احساس کا پلڑا زیادہ وزنی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زبیر کا لہجہ نہایت ملیح ہے اور یہ بات میں شاید اس سے قبل بھی کہہ چکا ہوں۔ زبیر جب اپنے ماحول سے شاکی نظر آتے ہیں تو بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں:

'نئے معاشرے کی بداعمالیوں اور بدچلنیوں پر
کسی نے نہ سنگِ ملامت ہی پھینکا
سُنا صرف اتنا
ابھی تم کو اس شہر کو جاننے میں کئی دن لگیں گے۔'

(نظم: ردِعمل)

زبیر کی نظم کا ابتدائی حصہ بتاتا ہے کہ شاعر کو یقین تھا کہ جب وہ لوگوں کو اطلاع دے گا کہ اس نے شہر کو شب کے پہلو میں کس حالت میں پایا ہے، تو لوگوں کو حیرت و استعجاب ہوگا اور وہ معکوس ردِعمل کا اظہار کریں گے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس صورتِ حال سے ملحق مندرجہ بالا اختتامیہ دراصل اس ماحول اور اس کی انحطاط پذیر اقدار پر ہر شاعر کا تبصرہ ہے۔ زبیر چونکہ Romanticism کے حوالے سے زیادہ جانے جاتے ہیں اس لیے ان کے یہاں الفاظ کی روانی کا tempo ذرا مدھم ہے۔ وہ بہت احتیاط سے، بڑی ملاحت کے ساتھ، استعارہ بہ استعارہ، علامت بہ علامت آگے بڑھتے ہیں جیسے تیراک پانی کی دھار کو کاٹتے ہوئے آہستہ روی سے آگے بڑھتا ہے۔

زبیر واقعہ کی تعمیم کرنے سے گریز کرتے ہیں اور وہ واقعہ کے اختصاص پر زور دیتے ہیں۔ مغرب میں یہی رومانٹک شاعری کا اسلوبیاتی خاصہ رہا ہے۔ بقول ولیم بلیک William Blake

"To generalise is to be an idiot. To particularise is the lone distinction of merit.

(شاعری میں واقعاتی تعمیم کارِ ابلہی ہے۔ اختصاص ہی معیار کا واحد امتیاز ہے۔)

زبیر کی نظم 'شریف زادہ' بھی ان کی شاعری کے اسی اختصاص کی مثال پیش کرتی ہے۔ یہ ایک شاعر کے مطالعے اور مشاہدہ کے Span کو ظاہر کرتی ہے۔ نظم کی ابتدا میں شاعر ایک شریف زادے کی مبتذل حرکات اور فحاشی کا ذکر کرتا ہے اور اختتام تک آتے آتے وہ پھر مبصر بن کر واقعہ کو Particularise کرتا ہے اور کہتا ہے:

'بزرگوں کی بانکی، سجیلی وجاہت کو
تم نے سرِعام یوں روند ڈالا
سلیقہ جو ہوتا تمھیں لغزشوں کا
تو اپنے بزرگوں کی مانند تم بھی
گھروں میں کنیزوں سے پہلو سجاتے
پئے عشرتِ دل، حویلی میں ہر شب
کبھی رقص ہوتا، کبھی جام چلتے
سلیقہ جو ہوتا تمھیں لغزشوں کا
تو یوں خاندانی شرافت، وجاہت
نہ مٹی میں ملتی، نہ بدنام ہوتی۔''

یہاں شاعر مبصر کے ساتھ ساتھ ناصح کا کردار ادا کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتا ہے، لیکن احتجاج کا لہجہ مصلحت پر مائل ہے۔ اسے شکایت لغزشوں سے نہیں بلکہ لغزشوں کی بدسلیقگی پر اعتراض ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی معاملہ لگتا ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ سچن کو ایل، بی، ڈبلو نہیں بلکہ کیچ آؤٹ ہونا چاہئے تھا، لیکن شاعر کے اس مصلحت آمیز Attitude کو محض سرسری

نگاہ سے دیکھنا غلط ہوگا۔ بین السطور میں Irony (طنز) کی کاٹ بھی گہری ملتی ہے۔ بقول کلینتھ بروکس:

All good poems contain ironic complexity. (Cleanth Brooks)

یعنی تمام اچھی نظموں کا وصف یہ ہے کہ ان میں طنز کی کاٹ ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے بہت سے لوگ اس ناقد سے اتفاق نہ کریں، لیکن مجھے یہاں اس کا حوالہ ضروری محسوس ہوا۔ اسی ہتھیار کو زبیر نے استعمال کیا ہے۔ یہ مصرعے دیکھئے:

'تو اپنے بزرگوں کی مانند تم بھی
گھروں میں کنیزوں سے پہلو سجاتے
پئے عشرتِ دل، حویلی میں ہر شب
کبھی رقص ہوتا، کبھی جام چلتے۔'

تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ شاعر اس حقیقت کو اجاگر کرنا اپنا فریضہ تصور کر رہا ہے کہ بزرگوں کی اسی رَوِش نے حویلیوں کو کھنڈر میں اور آبادیوں کو ویرانیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اسے بھی شاعر کا کمال تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ وہ کیفیت میں براہِ راست ملوث نہ ہوتے ہوئے احتجاج اور Irony کے Vehicles پر تخیل کو سوار کروا کر اپنی بات پیش کرتا ہے۔ ہر ذی نفس اپنی الگ شناخت رکھتا ہے اور شاعر بھی اس اصول سے مبرا نہیں ہے۔ زبیر اپنا علیٰحدہ تخلیقی رجحان رکھتے ہیں۔ ان کے تخلیقی سوتوں کا رُخ اور رنگ الگ ہے۔ ان کے یہاں جمالیاتی شعور Romantic sense ان کی شاعری کی زیریں لہر ہے۔ زبیر خود کہتے ہیں ''میری جدیدیت ایک اَپ ڈیٹیڈ کلاسزم تھی جس میں ادب کی Mystic بھی تھی۔ ہیئت کی قوتِ نمو بھی اور جمالیاتی ادراک بھی۔'' اسی لیے وہ رومانی شاعر کی حیثیت سے زیادہ معروف ہیں۔ وہ ماضی کو کبھی نہیں بھولتے، لیکن اس ماضی کو حال میں ضم کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ نظم 'واپسی' میں زبیر کا یہی کمال پایا جاتا ہے۔

''ہماری چاہتوں اور لغزشوں کے
سارے موسم جا چکے
تم آخری بوسے کی خواہش میں
لب و رخسار کی سوغات کیوں لائے؟
وصال و قرب میں بھیگی ہوئی برسات کیوں لائے؟''

زبیر کی ہر نظم بتاتی ہے کہ ان کا شاعرانہ مزاج نسبتاً نرم ہے۔ یہ ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ اس نظم میں وہ خود بھی ماضی کی سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں اور چاہتوں و لغزشوں کے موسموں کے گزرنے کا ماتم کر رہے ہیں۔ ان کے محبوب کے توشہ دان میں لب و رخسار کی سوغات ہے اور وصل و قرب میں بھیگی برسات ہے۔ مزاج کا یہی تنوع ہر شاعر کی انفرادیت کا معلن ہوتا ہے۔ جس انداز سے زبیر ناسٹلجیا کا تاثر دیتے ہیں، وہ انہی کے مزاج کا حصہ ہے۔ ان کی ایک اور نظم 'چارہ ساز' یوں شروع ہوتی ہے:

''تم اپنے منظروں میں گُم تھے
جب ہم نے صبا کے ہاتھ پر
رسمِ حنابندی کا ایک وعدہ بھیجا تھا
خزاں کے زرد چہرے پر
ہرے پتوں کی جب اُبٹن لگائی تھی.....''

جب میں نے یہ نظم پڑھی تو مجھے بے ساختہ رابرٹ براؤننگ کے Dramatic monologues یاد آ گئے جن میں خود کلامی کے گونا گوں پہلو روشن ہوتے ہیں۔ زبیر کی یہ نظم اسی زمرہ کی ایسی نظم ہے جو خالص مشرقیت اور مشرقی جمالیات نیز شگفتہ بیانیہ اسلوب کی آئینہ دار ہے۔

اب آیئے زبیر کی اس شاعری اور نظم نگاری کی طرف جس نے اہلِ نقد کو چونکا دیا۔ یہ تھا ان کی مسلسل نظموں کا سلسلہ ''پرانی بات ہے''۔ اس سلسلے کی نظموں کی خاصیت یہ ہے کہ یہ نظمیں حکائی لہجے کی نظمیں ہیں۔ ان نظموں نے ان کی نئی تخلیقی جہت پر اہلِ نقد کو متفق کر دیا۔ یہ نظمیں فنِ قصہ گوئی کو نثر کی ہیئت سے نکال کر جدید شعری اسلوب کے قالب میں ڈھالنے کا آغاز ہے۔ اس سلسلے نے نظم کے جوہریوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا قصہ گوئی کی شعری تجدید بھی کی جاسکتی ہے؟ انگریزی نظم میں اگرچہ یہ حکائی لہجہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ ہمیں اس کا ثبوت چودھویں اور پندرھویں صدی کے شاعر چاسر Chaucer کی ایک طویل نظم Canterburry Tales میں ساری حکائی نظمیں ملتی ہیں، لیکن اردو جدید نظم تک یہ لہجہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ زبیر نے اس جدت کو بڑی خوش سلیقگی سے اپنایا اور وہ اس کام میں نہایت کامیاب رہے۔ زبیر نے ایک جگہ لکھا بھی ہے کہ ''اپنی شاعری میں جس کو میں نے اپنے لیے شعری وصف اور حسن جانا، وہ ایمائیت اور ایجاز ہے۔ اس کے بعد تیسرا نمایاں عنصر غنائیت ہے۔ یہ وہی غنائیت ہے جو میری شاعری میں اکثر مقامات پر موسمِ گُل کا احساس دلاتی ہے۔''

اس مجموعہ کی ہر نظم کا پہلا مصرعہ یا فقرہ 'پرانی بات ہے' سے شروع ہوتا ہے۔ جو شاعر کو زمانی اعتبار سے دو مختلف دریچوں میں موجود دکھاتا ہے۔ ایک دریچہ زمانۂ حال کا ہے جہاں وہ راوی کی حیثیت سے کھڑا ہے اور دوسرا دریچہ ماضی کا ہے جس کی وہ بات کر رہا ہے اور اسلوب ایسا تازہ کار و جدید، زندہ و متحرک کہ لگتا ہے شاعر خود اس واقعہ کا حصہ رہا ہے۔ اگر آپ اس مجموعے کی نظم 'علی بن متقی رویا' کو لے لیں تو یہیں سے ہمیں شاعر کی نئی تخلیقی

جہت کا احساس ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے۔

'پرانی بات ہے لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے

....

علی بن متقی مسجد کے منبر پر کھڑا
کچھ آیتوں کا ورد کرتا تھا
جمعہ کا دن تھا، مسجد کا صحن
اللہ کے بندوں سے خالی تھا
وہ پہلا دن تھا مسجد میں کوئی عابد نہیں آیا

....

ہوا پھر یوں
منڈیروں پر، گنبدوں پر اَن گنت پَر پھڑ پھڑائے
کاسنی، کالے کبوتر صحن میں نیچے اُتر آئے

....

وہ پہلا دن تھا مسجد میں
وضو کا حوض خالی تھا
صفیں معمور تھیں ساری!''

میں نے اس نظم کو پوری نقل کرنے کے بجائے اس کے تین حصے کئے ہیں جو دراصل نظم کے تین مدارج ہیں۔ اول درجہ میں علی بن متقی رُویا، مسجد کے صحن میں کھڑا نمازیوں کا انتظار کر رہا ہے اور اس دن مسجد میں کوئی نمازی نہیں آیا۔ دوسرے درجہ میں کچھ کبوتروں کو مسجد کے صحن میں اترتا دکھایا گیا ہے اور پھر تیسرے درجہ میں نمازیوں کے نہ ہونے کے باوجود کہا گیا کہ 'صفیں معمور تھیں ساری'۔

ابتدائیہ سے لے کر اختتامیہ تک، ایک مکمل کیفیت موجود ہے جس سے قوتِ اظہار اور پھر ترسیلِ خیال، دونوں نے جلا پائی ہے۔ آخری دو مصرعے ملاحظہ کیجئے:

وضو کا حوض خالی تھا۔

یعنی مسجد نمازیوں سے خالی تھی۔ پھر دوسرا مصرعہ دیکھئے۔

صفیں معمور تھیں ساری!

اگر نمازی مسجد میں نہیں تھے تو پھر صفیں معمور کیسے ہو گئیں؟

یہی وہ اہم نکتہ ہے جس کو اجاگر کرنے کے لیے زبیر نے نظم کہی ہے کہ فطرت کا کوئی بھی کام اللہ صرف انسانوں کے بھروسے نہیں چھوڑ دیتا۔ ظاہری اسباب کی عدم موجودگی فطرت کا کاموں میں حارج نہیں ہوسکتی۔ نظم کا بیانیہ اسلوب اور اس کا حکائی لہجہ، دونوں نے ایک ایسے طرزِ اظہار کی بِنا ڈالی ہے جس نے زبیر کے تعلق سے بہت ساری غلط گمانیوں کی فضا کو ختم کر ڈالا۔ اس پر مستزاد، ان کی طویل نظم 'صادقہ' نے ادبی فکر پردازوں کو چونکا دیا۔ صادقہ ایسی طویل نظم ہے جس کا کینوس بہت وسیع ہے اور اس میں شاعر کے وارفتہ لہجے کی وہ ضوفشانی ہے جس نے جدید اردو نظم کے چاہنے والوں کو ایک نئے ذائقہ سے آشنا کر دیا۔ 'صادقہ' براہِ راست اپنے شریکِ سفر سے مکالمہ ہے اور شعر گوئی کے گونا گوں عناصرِ مستحسنہ سے متصف ہے۔ اس نظم کا ابتدائیہ تجاہلانہ استفسار ہے:

''صادقہ!
یہ طلوعِ صبح کتنے ملال دے گئی!
دن کی بساط بجھ گئی
رونقِ شہرِ شادماں لوٹ کے پھر سے آ گئی
سارے حنوط، صف بہ صف
راہ میں آ کے جم گئے
جتنے پری جمال تھے، بام پہ آ کے سج گئے
کیسۂ زر اُچھالتے ناقہ سوار آ گئے۔''

پڑھنے والے چونک گئے کہ ارے! یہ شاعر کیا کر رہا ہے؟

لیکن شاعر تو ایک طویل نظم کے لیے پس منظر تیار کر رہا ہے۔ وہ فلم کا سیٹ ڈیزائن کر رہا ہے تاکہ پڑھنے والے سب سے پہلے پس منظر کو اچھی طریقے سے سمجھ لیں تو پھر پیش منظر کی تفہیم میں آسانی ہوگی۔ جس طرح میدانِ جنگ میں فوجوں کی صف بندی کی جاتی ہے، ایسا لگتا ہے جیسے واقعات کی صف بندی ہو رہی ہے۔ یہ پوری نظم اسی واقعاتی تواتر اور حسنِ ترتیب کا نمونہ ہے۔ نظم، منظر بہ منظر آگے بڑھتی ہے:

''صادقہ! یہ زوال کی ساعتِ بدنصیب ہے
سارے قصیدہ گو، جلوسِ گریہ ملال ہو گئے
سارے کُلاہِ امتیاز طاق میں رکھ دیے گئے
سارے لباسِ فاخرہ، تن سے الگ کیے گئے۔
طَبل و عَلم نہیں رہے
کیسۂ زر نہیں رہے
سارے خزانے لُٹ گئے
سارے نشانِ اقتدار
ماہ و نجومِ اختیار
روغنِ خانۂ خمار
سارے کھرچ دئے گئے۔''

استعارات کا ایک بہتا ہوا دریا کہ آگے آگے بڑھا چلا جا رہا ہے، اپنی روانی میں مست، اپنے آپ میں البیلا، ندرت لیے ہوئے، جلوت میں بھی

خلوت کے مزے لوٹتے ہوئے۔ یہ اس طویل نظم کا خاصہ ہے۔ نظم کا تکملہ بھی نہ صرف خوب ہے، بلکہ اسی روانیٔ اظہار کا اعلامیہ ہے جو تمام نظم میں چھایا ہوا ہے:

''صادقہ!
تم میرے ہاتھ میں اپنا حنائی ہاتھ دو،
عرصہ گارزار میں تم میری ہم قدم رہو،
آؤ، کہ کسی پہاڑ سے آدمِ خاک کے لیے
دستِ دُعا اُٹھائیں ہم
صوت وصدا کی مشعلیں
چار طرف جلائیں ہم۔''

پوری نظم تقاضا کرتی ہے کہ اسے آنکھ بند کر کے متصور Visualise کیا جائے۔ اتنی تمام صفات کے باوصف کہیں کہیں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ تلمیحی ابہام نے تفہیم کی مٹھی کھولنے میں تھوڑی کسر ضرور چھوڑ رکھی ہے اور یہ اس بیانیہ اسلوب کی بے ساختگی کی وجہ سے ہے جس کی جدت زبیر کے ندرتِ خیال سے عبارت ہے۔ ان کی نظموں میں نت نئی لفظی تراکیب کی بھی ایک کہکشاں، ایک انجمن ہے کہ جو جھلمل جھلمل کرتی جاتی ہے اور نظم کے عاشقوں کو ایسی لذت سے واقف کرواتی ہے جو قرأت کے تلطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔ میں اپنے حسنِ انتخاب کے لحاظ سے چند مثالیں دے رہا ہوں:

''تخاطب پہ اصرار کرتی ہوئی
خوبصورت، ستارہ سی آنکھیں'
(نظم: ستارہ آنکھیں)
دیکھا جو بام کی طرف
سر سے عمامے کھل گئے

.....

گردشِ وقت قصر کو تیرہ وتار کر گئی
کل کے امیرِ شہر کو، کاسہ بدست کر گئی

.....

دھوپ کی تیز دھار سے
سارے بدن لہولہو
سارے اصول خاک میں
قول وقرار آگ میں''

.....

اب کے بہار آئی تو
پھول کی پتیوں پہ اُوس
دل کی کتاب رکھ گئی

.....

وہ جو اسیرِ دام تھے
کُنجِ قفس میں رو دیے
کُنجِ قفس کھلا نہیں، رقصِ صبا ہوا نہیں
صادقہ! اس بہار میں ان کا زیاں ہوا بہت
جن کے لیے درِ قفس ساعتِ پُر بہار میں
بند رہا، کھلا نہیں!
(نظم: صادقہ)
شمیمِ زلف کو ہاتھوں کے گلدانوں میں رہنے دو
لبوں کو نکہتِ انفاس میں تحلیل ہونے دو
نقابِ گُل کو چٹکی سے اُٹھاتے کیوں نہیں ہیں ہم؟
(نظم: لمحے پوچھتے ہیں)
ہماری غربتوں کے وہ سنہری روز وشب تھے
جب ہمارے فاقے پر
امارت رشک کرتی تھی
(نظم: ہم نہیں ہونے کے)
حاکمِ وقت نے
دستِ قاتل کو بوسہ دیا
(نظم: بے نواؤں کے نام)
اور کسی محمل سے باہر جھانکتی آنکھوں میں
اپنے عکس کو تحلیل کر دیتے
چراغوں کو ترستی شب کے محرابوں میں
روشن دانیاں رکھتے

.....

کہیں خانہ بدوشوں کے لبوں سے تم
غلاموں کی رہائی کا کوئی نغمہ سُناتے!
(نظم: سفر کا رائیگاں جانا)

غرض ایک طویل فہرست تیار ہوتی ہے جو زبیر کی نظموں میں جدت طبع کے جواہرات اور اظہار کے اسلوب کی ندرت کے تمام محاکات کی شیرازہ بندی کا فریضہ انجام دے گی۔ شرط یہ ہے کہ ہم ایسی شاعری کی طرف مکمل طور سے نگاہِ نقد کو مرتکز کر لیں۔ ابھی ان کی شاعری کے کئی پہلو روشن ہونے باقی ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ اہلِ نقد اس سمت کب اپنی نظر گھماتے ہیں۔

○○